

ایمن رضا

سکاش گھر

مجموعی اقسام کا خلاصہ:

چاندنی بی ایک عمر رسیدہ اور سر سے گنچی خاتون ہیں۔ ۴۲ء کے ہزارے میں چاند کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے۔ چاند کے ابو دین بابا، بھائی بستم، تین چھوٹے بھائی، ان کی چھ بیٹیاں اور گھر کا ملازم لڑکا رحبان..... اس خاندان کو جو بھلیاں شہر میں ایک ”لکشی حویلی“ الاٹ ہوئی ہے۔ جس کا نام وہ بدل کر ”دین حویلی“ رکھ لیتے ہیں۔ ایک رات چاند کو بھلی کی دہلیز پر ایک بچی نوکری میں پڑی ہوئی ملتی ہے۔ دین بابا کی مخالفت کے باوجود چاند اپنے مکتبہ تراش کی اجازت سے اس بچی کو گود لے لیتی ہے اور اس بچی کا نام مندل رکھتی ہے۔

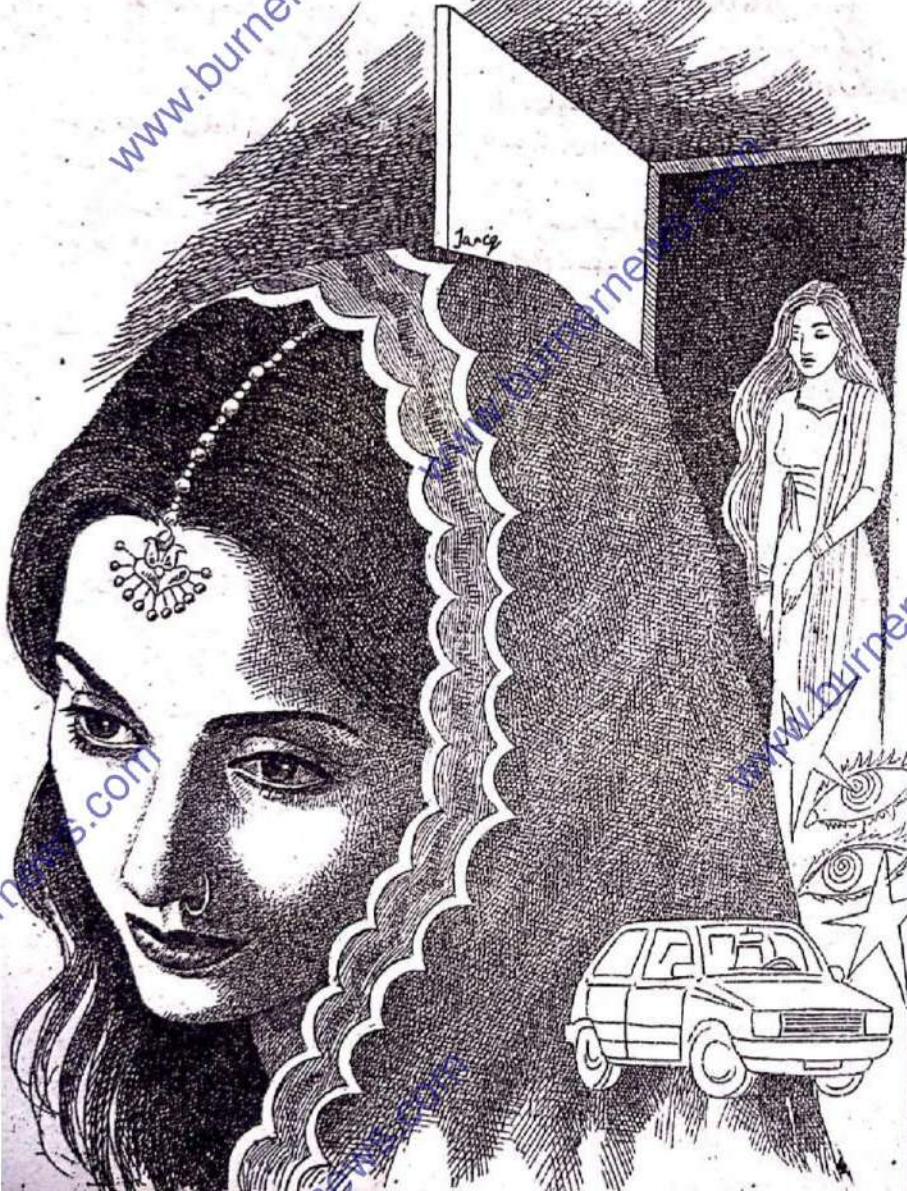
رحبان یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند کی شادی بہت جلد تراش سے ہونے والی ہے دن بدن چاند کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ چاند سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ چاند رحبان سے کہتی ہے کہ وہ صرف تراش سے محبت کرتی ہے۔ رحبان کے دل میں تراش کے لیے نفرت بڑھنے لگتی ہے۔ بستم کے مشورے پر رحبان تراش کو مل کر دیتا ہے اور دین بابا سے چاند کا ہاتھ مانگتا ہے۔ دین بابا کی التجا پر چاند رحبان کے رشتے کو منظور کرتے ہوئے شادی کی رضامندی دے دیتی ہے۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو پاتی.....

۱۹۷۲ء..... اب تیس سال کا عمر گزر چکا ہے اور مندل سب گھر کی پانی لڑکیاں بھی جوان ہو چکی ہے۔ مندل ان سب میں سب سے زیادہ شرارتی ہے۔ عید گاہ میں افشیں دو خواتین کو مندل کے بارے میں ”ناجانزہ“ کا لفظ بولنے ہوئے سختی ہے تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

میر زادو کو دین بابا کی بہن بھائی ہیں۔ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے زویا کو جو بھلیاں شہر میں اپنے بھائی کے ساتھ آنا پڑا ہے۔ ان کا قیام عارضی ہے۔ اس عارضی قیام میں میر زادو کی ملاقات مندل سے ہوتی ہے۔ مندل

میر زادو کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتی ہے۔ زویا کو دونوں کا ملنا اور بے تکلف ہونا کچھ زیادہ پسند نہیں آتا..... وہ میر زادو کی نسبت اپنی نند سے ملے کر دیتی ہے۔

نویں قسط
لا تعداداش کے بچوں سے بننا وہ نکوتا ”ناش گھر“ تھا کہ کھل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ سا گوان کے تختے پر



اس کی بنیاد بنائے بسائی اسے اونچائی میں پروان چڑھاتا ہوا بڑھا رہا تھا۔ عجیبے کہاں غلطی رہ جاتی تھی اس سے..... اور پرتک پہنچنا نصیب ہی نہیں ہو رہا تھا۔ روشن نیگم کیسی تاقی ناں اس میں..... وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری تاش سے قطب بنا دیا کرتی تھی۔ بس بستی سے ہی یہ معمولی کام سیکھانہ جارہا تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی تھی۔ لیکن تھر دوسری تیسری منزل پر دھڑام سے نیچے گر جاتا تھا۔ چوٹی بار میں غصے سے بستی نے تاش کے چوں پر لپے ہاتھ مارا تھا کہ وہ اڑتے ہوئے فرش پر پڑنے کا لین پر جا پڑے تھے۔

”سلطان..... اور اگلے ہی بل اس نے آواز لگائی تھی۔“

”جی مالک.....“ سلطان فوراً سے حاضر ہوا تھا۔

”میرا حقہ گرم کے لاؤ..... اور کونکوں پر چھال ڈال دینا..... میرا سر درد کر رہا ہے۔“

”جی مالک.....“ سلطان حکم سننے ہی چلا گیا تھا۔

بستی بیٹھ کر سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ سوچیں گہری تھیں۔ حقے کے دھوئیں سے بھی زیادہ گہری..... جنہوں نے بستی کا دماغ چلم کی طرح گرنے کیا ہوا تھا۔ نجانے کیا ہو گیا تھا جو ملی کے معاشی حالات کو..... جو کہ ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ بلکہ بڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی کوشش کر لی تھی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھیں۔ صرف کوششیں ہی راگناں ہوئی تھیں۔ بلکہ محنت، وقت، قوت اور سرمایہ بھی راگناں ہو گیا تھا۔ کام پر بھر پور توجہ دی گئی تھی۔ رنگوں کو بدل لایا تھا۔ کام کی نوعیت کو بدل لایا تھا۔ ہر چیز میں جدت لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن منڈی میں ان کے کام کی ساکھ جو گر چکی تھی وہ بحال ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس بات نے بستی اور رحبانی دونوں کو ہی تھکا دیا تھا۔

تین لاکھ کی رقم جو سچے ہیروں کو بیچنے کے بدلے میں ملی تھی۔ بستی کو لگا تھا کہ اس سے بہت سے کام ہو جائیں گے۔ جو سرمائے کی وجہ سے ادھر سے تھے۔ لیکن وہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ اتنا بہت سا قرض چڑھ چکا تھا کہ چار ہیروں کو بیچنے سے جو تین لاکھ ملا تھا۔ وہ قرض کو ادا کرنے کی صورت ہی نکال گیا تھا۔ اور بستی ایک بار پھر سے خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ کوئل نے ان تین لاکھ روپوں کو لے کر الگ شکوہ کیا تھا۔

”مجھے لگا تھا کہ تم میرے لیے سونے کی پازیں لاؤ گے۔“ ہنادی روٹھتے ہوئے پلنگ پر بیٹھی وہ اپنی بھوٹی پازیبوں کو پاؤں سے اتارتے ہوئے بولی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس نے آنکھوں کو کچھ اس اداسے حرکت دی تھی کہ بستی کا تو جیسے اس پر دل ہی آ گیا تھا۔ پہلی ملاقات سے لے کر اب تک بستی کو اس پر بہت بار دل آیا تھا۔ اس کا پہلا، دوسرا، تیسرا پیار کوئل ہی ٹھہری تھی۔

”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے پاس تین لاکھ کی رقم ہے۔؟“ وہ چلم چھوڑ کر لین پر سے اٹھ کر پلنگ پر کوئل کے پاس جا بیٹھا تھا۔

”دو لوگوں نے..... ایک تو روشن بائی نے..... دوسرا.....“

”ایمن نے کیسے.....؟“

”اب تو پورا حویلیاں شہر جاتا ہے کہ تم دونوں دوست اپنی ہر چیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہو۔ تو تم نے تین لاکھ میں سے جو ڈیڑھ لاکھ روپے رحبانی کو دیے اس نے ایمن کو ان سے سونے کی بالیاں بنا دیں۔“ کوئل نے پلنگ کی پشت سے اپنی کمر ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔

کوئل کی بات پر بستی کو شرمندگی ہوئی تھی۔ ایمن کو سونے کی بالیاں مل جانے سے..... کوئل کا شکوہ کرنا بجا تھا۔ لیکن رحبانی نے یہ کیا حرکت کی..... اس نے تو کہا تھا کہ اسے ہیوس کی اشد ضرورت..... اور جہاں تک بستی ی جانتا تھا، رحبانی کو پیسوں کی دافعی ہی نہیں ضرورت تھی۔ اس پر بھی بہت سنا..... غاب.....

کیوں اس نے ایمن کو سونے کی بالیاں بنا دیں تھیں۔ وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ جب سے اسے چاند نے مسکرایا تھا۔ وہ عجیب جھپٹی ہو چکا تھا۔ محبت پانے کے لیے وہ کچھ بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہدیا ایمن نے ہنس کر فرمائش کی ہوگی اور رحبانی اپنا سارا قرض بھول گیا ہوگا۔

”میں تمہیں بھی جلد ہی سونے کی پازیں بنوا دوں گا۔“

”دوب..... اب دوبارہ تو میرے ملنے سے رہے۔ یہ اتفاق زندگی میں ایک بار ہی ہو جائے تو معجزے سے کم نہیں ہوتا۔“

”جانتا ہوں۔“ بستی نے مایوسی سے کہا تھا۔ کوئل کی بات نے اسے مزید مایوس کر دیا تھا۔

”کیا ہوا۔ تم کچھ پریشان دکھ رہے ہو۔“

”ہاں..... ہوں تو سہی.....“

”کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔“

اس نے بستی کو اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ بستی اٹھ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا تھا۔ کوئل نے انیس اس کے کندھے پر گر آ دیا تھا۔ بستی کو اس کے وجود کی گرمی پہنچتی تھی۔ بستی کو سالوں پہلے کی ایک رات یاد آ گئی تھی۔ جب کوئل پہلی بار اس کی آغوش میں آئی تھی۔ اس بات کو مدتیں گزر چکی تھیں۔ کوئل کے وجود کی گرمی میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

”حویلی کے معاشی حالات بہت خراب ہیں۔“

اس نے وہ بات بتادی تھی جو شاید ایک کوٹھے والی کو بھی نہیں بتانی چاہیے۔ لیکن بستی یہ ہی دیکھنا چاہتا تھا کہ اب خراب حالات میں اس کے ساتھ کون کون ہے۔

”کیوں.....؟ کام کا مندا جا رہا ہے کیا؟“

”ایسا ہی سمجھ لو.....“

”یہ سب زندگی کا حصہ ہوتا ہے پیارے بستی..... کبھی زیادہ منافع، کبھی بہت سا نقصان۔“ اس نے سر اٹھا کر گنگنانے کے سے انداز میں کہا تھا۔

”لیکن کافی عرصے سے نقصان ہی نقصان ہو رہا ہے۔“

”پھر تم کاروبار بدل لو.....“

”بدل کر کون سا شروع کروں۔“ بستی جوش سے بولا تھا۔ اسے کوئل کی بات اچھی لگی تھی۔

”میں کچھ زیادہ تو نہیں کہہ سکتی..... شاید روشن بائی کچھ مفید مشورہ دیں سکیں۔“

”کہاں ہیں وہ.....؟“

”اپنی بہن سے ملنے گئی ہیں۔ شام تک آ جائیں گی۔“

”پھر شام تک میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔“ بستی نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ کوئل نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ بستی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ کوئل مسکرائی تھی۔ اس کے رنگے ہوئے سرخ ہونٹ گلاب کومات دینے لگے تھے۔

”کسی بھی کام میں نہیں..... ہم دونوں نے ساری زندگی چٹکیں اڑائی ہیں۔“ بستی نے صاف کوئی سے کہہ دیا تھا۔

”تو کارخانے کا سارا کام کیا چاند نے سنبھالے رکھا ہے؟“

”ہاں..... اسی نے شروع سے کام کو سنبھالا ہوا تھا۔“

”یہ تم نے غلطی کی بستی..... تمہیں اس سب میں خود تاق ہونا چاہیے تھا۔ تمہاری چالاک بہن نے جان بوجھ کر تم دونوں کو پیچھے رکھا۔“

بستی چپ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں..... چاند کا چہرہ تصور میں لاتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر چالاک کی کوکھ بوجھ لگا تھا۔ چاند ایسی تو نہیں لگتی تھی۔ تھیں سب اتفاق ہی تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ہی ماں میں خرد برد کرتی رہی ہے۔ اسی باعث تمہیں اتنا نقصان ہوا ہے۔“

”نہیں..... وہ ایسی نہیں ہے۔“

”تم بہت بھولے ہو بستی..... ابھی بھی نہیں سمجھ پارہے تمہارے اپنوں نے تمہیں لوٹ کھاپا ہے۔“ سرد پلاٹے ہوئے روشن بیگم نقصان کے اصل ذمہ داروں کی نشان دہی کر رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بستی کو چاند کے خلاف بھڑکائی تھی۔ حویلی کا جو نقشہ بستی اور درختی کی باتوں سے اس کے ذہن میں اتر اٹھا وہ تو بس اسی باعث بات کر رہی تھی۔

”اب کیا کرنا چاہیے؟“

”کام تم دونوں کوئی کر نہیں سکتے۔ سرمایہ تمہارے پاس ہے نہیں..... ایسے میں کیا کیا جاسکتا ہے؟“ روشن بیگم سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ اس کے پاس خیالات کا ڈبیر تھا۔

”تمہاری حویلی کی حالت کیسی ہے بستی؟“

”بہتر حالت میں ہے۔“

”اگر بہتر حالت میں ہے تو تمہاری حویلی کو سرائے میں بدلا جاسکتا ہے۔“ روشن بیگم نے انھوں کو روشن کرتے ہوئے کہا تھا۔ بستی حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ روشن بیگم نے تو کمال کا خیال پیش کیا تھا۔ واقعی ایسا ہو سکتا تھا۔ حویلی کو سرائے میں بدلا جاسکتا تھا۔ ایک منگے سرائے میں.....

”بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے اس چیز کا بالکل بھی تجربہ نہیں ہے۔“

”میرے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بستی..... میں ہوں ناں..... میں تمہاری مدد کروں گی۔“ روشن بیگم فراغ دلی سے مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔ ”بس مجھے تو میرے کیشن سے مطلب ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہو میرے مزاج کو۔“ وہ ہنسی تھی۔ چار اکہرا اس کی ہنسی سے سے چکا تھا۔

”اور آپ بھی جانتی ہیں میرے مزاج کو..... میں آپ کا کیشن نہیں روکتا۔“

”ہاں..... جانتی ہوں۔ تب ہی تو تمہیں لاکھوں کا خیال پیش کیا ہے۔ تم ایسا کرو مجھے اپنی حویلی دکھاؤ..... شاید میں کچھ مزید مشورہ دے سکوں۔“

”کیوں نہیں..... جب دل کرے۔“ بستی نے فوراً سے آمادگی سے دی تھی۔ یہ سوچے بچائے روشن بیگم کا حویلی میں آنا وہاں کے کینوں کو کسی قدر برا بھی لگ سکتا ہے۔

☆☆☆

بزیوں کی آمد آمد تھی۔ دن نکل کر بھی جیسے کسی کی آغوش میں چھپا رہا تھا۔ دھوپ بھی مدھرتا سے زمیں پر گرتی تھی۔ جسے زمین کا جھجھکاؤ کوکچ کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔ مندل کو سب بہت جھانک رہا تھا۔ وہ

نہیں جانتی تھی کہ وہ دن کچھ عجیب سا ہے۔ اس دن سب عجیب و غریب واقعات ہونے والے تھے۔

”یہاں کا بازار تو کافی بڑا ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرزا نے کہا تھا۔

”تم نے پہلے نہیں دیکھا تھا کیا؟“

”نہیں، میں صرف بڑی سڑک تک ہی رہا تھا۔ دیکھے بھی مجھے صرف کھانا ہی خریدنا ہوتا تھا۔“

”تو پھر یہاں ڈویا آئی کو ضرور لے کر آنا۔ انہیں ہمارے شہر کی ہر چیز متھرتی ہے۔“

”ہاں..... مجھے کہہ رہی تھیں کہ یہاں کا تو دریا بھی نہر سے زیادہ بڑا نہیں ہے۔“

”کیا ج میں.....؟“ مندل ہنسی لگی۔ اسے اس بات نے بہت غصہ کیا تھا۔

”ہاں..... وہ اس شہر کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن تمہارے گھر سے آنے کے بعد کچھ نارل ہو گئی ہیں۔ تم لوگوں کی دعوت نے ان پر بہت اثر ڈالا ہے۔ بہت تعریف کر رہی تھیں تم سب کی۔ خاص کر چاندی کی۔“

”میری امی تو ہیں ہی ایسی کہ ان کی تحریف کیے بنا رہی نہیں جاتا۔“

”اور چاندی کی بیٹی بھی،“ میرزا نے بے اختیار ہی کہہ دیا تھا۔ مندل کی سانسیں جھجھکتی ہوئی تھیں۔

”آؤ، اس دکان میں چلتے ہیں۔“ اس نے بلاوجہ ہی ایک دکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ محنت مٹانے کا

فوری رد عمل تھا۔

”اس دکان میں کیا ہے؟“ وہ مندل کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ وہ دکان جو باہر سے عجیب و

غریب تصاویر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور جہاں لکھا تھا کہ ”ارشادی بابا سے مستقبل کا حال جانے۔“

”جادوگر..... یہ مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔“

”تمہیں مستقبل کا حال جانتا ہے؟“

”نہیں..... صرف جادوگر کو تک کرنا ہے۔“ مندل نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ ”آجاؤ اندر۔“ میرزا

بہتے ہوئے مندل کے پیچھے گیا تھا۔

اندروں دکان کا حال ایسا تھا جیسے وہ دکان پہلے بھوت بگلا رہ چکی ہو۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو ڈرانے

کے لیے بھی وہاں سارے اسباب موجود تھے۔ گند تو نہیں تھا۔ لیکن بے ترتیبی بہت تھی۔ دیواروں پر جالے

نہیں لگے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حالت ایسی تھی کہ جالے ان سے بہتر لگتے ہیں۔ تصاویر کا تو ڈھیر لگا ہوا تھا۔

دیواروں پر تو لگی ہی ہوئی تھیں۔ چھت پر سے بھی زنجیروں کی مدد سے لٹک رہی تھیں۔ پنائیں جادوگر تصویروں کا

دکان تھا یا نہیں لیکن اس نے بہت ناک ماحول خوب بنا رکھا تھا۔

”کوئی ہے یہاں.....؟“ مندل نے خالی دکان کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”لگتا ہے کہ جادوگر اپنا ”قیمتی“ سامان چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا ہے۔“ میرزا دہناتا تھا۔

”جادوگر یہاں ہی ہے۔“ آواز گونجی تھی۔ دونوں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تھا۔ دکان تو خالی

تھی۔ آواز کہاں سے آرہی تھی۔

”انگل جی! کہاں ہیں آپ.....؟“

”بس دو منٹ.....“ آواز نے کہا تھا۔ اور پھر ایک لمبی جہاں لی گئی تھی۔

میرزا دہننے لگا تھا۔ اسٹول جو گندے کپیس سے ڈھکا ہوا تھا اس کے نیچے سے جادوگر کا کمزور سا وجود برآمد

ہوا تھا۔ باہر نکل کر اس نے کھل کر گھڑائی لی تھی۔ تب ہی دونوں کی نظر اس کے حلیے پر پڑی تھی۔ اس نے پانچ سال

کے بچے کے سائز کی پینٹ پر بے حد کھلی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بال ایسے کھرے تھے جیسے ماں نے دیر سے گھر

آنے پر خوب کس کس کے بال نوچے ہوں۔ کرا لیے جھکی ہوئی تھی جیسے بجائے کتنے دن مرغا بنا رہا ہو۔ میرزا دے اپنی کسی چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔

”سردی بہت ہے ناں..... تو بس اسی لیے آنکھ لگ گئی۔“ ارشادی بابا نے آنکھوں کو دھو کر دیکھا تھا۔
”صندل! اس سے کیا مستقبل کا حال پوچھنا ہے۔ اس کا تو ہاں حال خراب ہے۔“ میرزا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

جادوگر شد و دے کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔

”کیا تلاش کر رہے ہیں آپ.....؟“

”میری ٹوپی..... مل نہیں رہی.....“

”یہ والی..... صندل نے ایک جگہ سے ٹوپی اتار کر اس کے سامنے کی تھی۔“

”لو دیکھو ذرا..... سامنے کی چیز نظر میں آئی.....“ سولا ہیٹ پکڑ کر وہ سر پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔

”تو پھر آپ میرا ہاتھ کسے دیکھیں گے.....؟“

”میں ہاتھ نہیں دیکھتا لڑکی.....“

”تو پھر.....؟“

”میں مانتے پڑتا ہوں۔“ اس نے صندل کو دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا تھا۔ اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے جادوگر بہت سنجیدہ لگا تھا۔

”بیٹھو یہاں.....“ جادوگر نے اسے اپنے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ صندل کا دل تو نہیں کیا تھا بیٹھنے کو..... لیکن وہ بیٹھ گئی تھی۔ جو کر دیکھنے والے جادوگر سے اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ جادوگر اپنے سامنے بٹھائے اسے گھورتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے صندل کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور اپنی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ میرزا دھڑکڑا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سب دلچسپ ضرور تھا۔ لیکن اسے کوئی جھجھکی نہیں تھا کہ جادوگر کیا کہتا ہے۔

”ہمیں بچپن میں ایک بار بے ریش کیا گیا تھا۔ جانتی ہو ناں یہ بات.....؟“

صندل نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا تھا پھر ”ہاں“ میں سر ہلایا دیا تھا۔ جادوگر کے لبوں پر مسکراہٹ آنے کے بجائے مزید سنجیدگی آئی تھی۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا وہ اپنا انداز درست ہو جانے پر مسکراتا۔ لیکن اس کے چہرے پر افسوس پھیلا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”کیوں.....؟“ وہ ایسے بولی تھی جیسے کسی گہرے کنویں سے بول رہی ہو۔

”جو کام معمول سے ہٹ کر ہوں ان کا رد عمل بھی غیر معمولی ہوتا ہے۔ ہمیشہ جھپکنے والے سورج پر جب گرہن لگتا ہے تو خوف پھیلتا ہے۔ ہوا رز میں برز لڑا آتا ہے تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔“

”یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں..... پچھو پچھو جانتا ہے یہ بات۔“ میرزا نے مداخلت کی تھی۔ جادوگر نے اس کی بات جیسے ہی نہیں سنی تھی۔ وہ صندل کے ماتھے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

”اور بعض غیر معمولی واقعات کا اعادہ ہوتا ہے۔“

”اعادہ مطلب!“

”جن دنوں کا دوبارہ پھر سے ہوتا..... پاپٹ کرواپس آتا..... آسانی بجلی کا ایک ہی مقام پر بار بار گرتا..... آسنی نساں کا ایک ہی بستی سے بار بار پھوٹا.....“

”قدرتی باتیں ہیں سب۔“

میرزا دے نے کہا تھا۔ جادوگر جس کا نام ارشادی بابا تھا نے میرزا کی طرف دیکھا تھا۔

”خاندان میں بڑے لڑکے کا جوان ہونے سے پہلے مرجانا..... بڑی بیٹی کا ماں سے پہلے بیوہ ہونا.....“

جھوٹی لڑکی کا کسی حادثے میں مرجانا..... کیا یہ سب بھی قدرتی ہے تمہاری نظر میں.....“

میرزا دے جواب ہو کر چپ ہو گیا تھا۔

”اے خاندانی واقعات کا پاپٹ کر آتا کہتے ہیں۔“ جادوگر کہتا جا رہا تھا اور صندل سنی جا رہی تھی۔ وہ چپ ہو چکی تھی۔ بالکل چپ..... جادوگر کے پاس آنے کا غیر ضروری کام اس نے آخر کیا ہی کیوں تھا۔

”میرے ساتھ کون سا واقعہ دوبارہ ہوگا.....؟“

صندل کے سوال پر ارشادی بابا سر دھڑکے کے ساتھ اسے دیکھنے لگا تھا۔

”کتنے عرصے ہوئے.....؟“ میرزا دے نے جلدی سے پوچھا تھا۔

”میں اگلی بار آنے پر لوں گا۔“

”مجھے اگلی بار یہاں نہیں آنا..... میں ویسے بھی یہاں کا نہیں ہوں۔“

”تمہاری بات نہیں کر رہا..... میں تو اس کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے صندل کی طرف نظروں ہی نظروں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ صندل جلدی سے وہاں سے اٹھی تھی اور باہر کو بھاگی تھی۔ میرزا داس کے پیچھے آیا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“

”پتا نہیں..... اس نے مجھے ڈرا دیا ہے۔“

”کیا بات کر رہی ہو یا ر.....“ میرزا دھوکھلی سی ہنسی کر بولا تھا۔ ”اس نے بات ہی کیا کی ہے۔ کچھ بھی نہیں..... صرف اپنے لفظوں میں تمہیں الجھایا ہے۔ سو رنج گرہن..... چاند گرہن..... سب کو پتا ہے ان باتوں کا۔“

بے ریش ہونے والی بات بھی کچھ تو تھی نہیں..... سب بچے بچپن میں بے ریش ہوتے ہیں۔“

”ہاں..... لیکن تم نہیں جانتے میر.....“ صندل نے حاجی بوا کی ستائی باتیں یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا.....؟“

”کچھ نہیں..... پھر کبھی بتاؤں گی۔“ اس نے اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اندھیری دکان میں سے باہر روشن دن میں نکل آنا ویسے بھی مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ کچھ پرسکون ہوئی تھی۔

”کیا نہیں بازار سے کچھ لینا ہے۔“ چلتے چلتے میرزا دے نے پوچھا تھا۔

”کیوں.....؟“

”تم بس چلتی جا رہی ہو۔ میرے خیال سے تو ہمیں اب واپس چلنا چاہیے۔“

”مجھے پازتیں ملنی ہیں اپنے لیے.....“

”تو لے لو.....“

”کوئی دکان نظر آتی ہے تو لیتی ہوں۔“ اب وہ اسے کیا بتاتی ہے کہ وہ تو اصل میں کچھ لینے آئی ہی نہیں تھی۔ بازار جانے کا تو اس نے میرزا دے کے سامنے بہانہ بنایا تھا۔ ایک تو یہ لڑکا خود سے کچھ سمجھتا ہی نہیں.....

کہاں گی آج کل کے لڑکوں کی سمجھ..... یہ سمجھ کیوں نہیں جانتے کہ لڑکی کے دل میں کیا چل رہا ہے۔

چلتے چلتے وہ دونوں رکے تھے۔ بازار کے دوسرے سرے سے انہیں کچھ شور سنا دیا تھا۔ کچھ عجیب و غریب

سا شور، اونچی اونچی آوازیں اور ساتھ ہی کی آواز بھی..... جیسے یا تو کوئی جتنے نئے جگڑ رہا ہو یا جگڑتے جگڑتے
 ہنس پڑا ہو۔

تیز حیر چلتی وہ تقریباً بھاگی ہوئی مندل کے پاس آئی تھی۔ مندل اور میرزا داماوش کھڑے تھے۔ نجانے کیا دیکھا تھا اس نے مندل میں کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر رک گئی تھی۔ اور پھر اگلے ہی لمبے اس نے اپنے دونوں ہاتھ مندل کے کندھوں پر رکھ دیے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔ مندل کو ایسے لگا تھا جیسے اس کے کندھے کسی لوہے کے شے میں جکڑے گئے ہوں۔

”کوئل کا بچہ سفید ہے۔“ آنکھیں پھاڑے وہ بڑبڑاتی تھی۔ مندل نے اوجھ سے اسے دیکھا تھا۔

”جنگ مت کریں۔“ میرزا نے بوجھیا کے ہاتھ مندل کے کندھوں پر سے ہٹائے تھے۔ وہ بوڑھی عورت مندل کو دیکھتی جا رہی تھی۔

”لیکن تمہیں تو پازیتیں ملتی تھیں۔“
 ”وہ میں پھر کسی دن لے لوں گی۔“ اس نے واپس کے لیے چلتے ہوئے کہا تھا۔

کچھریل کی چھت پر لگے جالوں کو وہ کافی دیر سے گھورتی جا رہی تھی۔ پھر جب وہ اس کام سے استراحتی تھی تو اس نے چھت کے درمیان میں ڈالے گئے لکڑی کے تختوں کو گنا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ تکلیف کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دھیان بنانے کے لیے اس نے اس چلن کو کھوجنا شروع کر دیا جو دروازے پر ڈالی گئی تھی۔ کمرے میں نیم لگا ہوا تھا۔ چلن میں سے بہت معمولی سی روشنی باہر سے اندر کی طرف آرہی تھی۔ ایک ایک درز کی روشنی کو دیکھتے ہوئے اس کا دماغ عجیب و غریب سی کہانیاں بنا رہا تھا۔ خوف ناک کہانیاں.....

وہ خاموش رہی تھی۔ اس میں بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اس کے نچلے وجود نے اس کے جسم کی ساری طاقت کو نچوڑ لیا تھا۔
 ”بس تھوڑی دیر اور.....“ دانی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جب بھی خاموش رہی تھی۔ پھر اسے ایسے لگنے لگا تھا جیسے اس کے جسم سے روح بس نکلنے والی ہو۔ اور جس وقت اسے لگا کہ وہ بس مرنے کے قریب ہی ہے تب ہی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز گونجی تھی۔ ایک گھر اسانس اس کے حلق سے برآمد ہوا تھا۔
 تھوڑی دیر کے بعد بچہ بھی روتے روتے خاموش ہو گیا تھا۔ یادہ بہت ہی ٹپکی آواز میں رو رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی جمائی تھی۔ گہری خاموشی..... اس کی ساس جولوہر پہلے تک چپک رہی تھی اب ایک دم سے چپ ہو گئی تھی۔ دانی کو بھی جیسے سانپ سوگھ گیا تھا۔ جبکہ وہ تو انتظار کر رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی اسے بتائے کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی.....

”حرام زادی..... کہاں جا کر منہ کالا کیا ہے جو تیرے سیاہ پٹن سے ایسا سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔“ ساس غصے سے دھاڑی تھی۔

☆ ☆ ☆
 ملازموں کو حویلی کی اچھے سے صفائی کرنے کو کہا گیا تھا اور یہ صفائی کوئی عام صفائی نہیں تھی۔ بلکہ ایسے لگ
 ہوا جیسے حویلی نئے سرے سے تیسر ہونے جا رہی ہو۔ بادریجی کو بہترین کھانے کی تیاری کرنے کا بھی سے کہہ دیا
 گیا تھا۔ بیٹیوں کو بھی اس دن تیار رہنے کو کہا گیا تھا جس دن روشن بیگم نے ان
 کو گھر تشریف لائی تھی۔

”کس چیز کی تیاری ہو رہی ہے۔؟“ اس نے حامی بوا سے پوچھا تھا۔
 ”پتا نہیں..... بستی نامی گھر کے ملازموں سے کہا ہے کہ جیسے تک اسے یہ حویلی عیشی کی طرح چمکتی ہوگی۔“

چاند بڑے کمرے میں کھڑی تھی۔ جہاں انشیں موجود تھی اور وہ کاغذ قلم لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ چاند کو وہاں دیکھ کر انشیں نے فوراً اسے کاغذ اپنے پیچھے چھپایا تھا۔ چاند نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر تو کیا تھا لیکن یہ ان کے نزدیک کوئی اہم بات نہیں تھی۔

”کیا گھر میں کوئی آرہا ہے انہیں۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ آپ کو نہیں معلوم کیا۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کون آرہا ہے۔؟“

”بستی بابا کے کچھ خاص مہمان آرہے ہیں۔ انہیں نے ناچاہتے ہوئے بھی ”خاص“ کو خاص لےجے میں ادا کیا تھا۔“ انہوں نے سب کو تیار تیار رہنے کو کہا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ مہمان کا اچھے سے استقبال کرنا ہے سب نے۔۔۔۔۔ اور خوب خاطر مدارت بھی کرنی ہے۔“

”کتنے لوگ ہیں۔؟“

”شاید۔۔۔۔۔ ایک ہی ہے لیکن کچھ خاص ہے تب ہی تو اتنی تیاری کروائی جا رہی ہے۔؟“

”اچھا۔۔۔۔۔ خیر یہ مندل کہاں ہے۔ صبح سے نظر نہیں آرہی۔۔۔۔۔“

”میں یہاں ہوں۔“ دروازہ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”کہاں تھیں تم۔۔۔۔۔ صبح سے غائب ہو۔؟“

”ہاں مندل۔۔۔۔۔ کہاں تھیں تم۔۔۔۔۔؟“ انہیں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس سے پوچھا تھا۔

”بازار میں تھی۔ پازیں لینے لگی تھی۔“

”انتہی دیر ہوئی خریدتے خریدتے۔۔۔۔۔ انہیں بس ہنس دینے کو ہی تو تھی۔ مندل نے اسے گھورا تھا۔

”نہیں چاندانی۔۔۔۔۔ میں کچھ دیر اکیلے میں باغ میں بیٹھ گئی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جا کر تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔ استاد جی آنے والے ہوں گے۔“

”کون سے استاد۔۔۔۔۔؟“

”تمہیں ستار بھانا سکھائیں گے۔“

”لیکن میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ مجھے ستار نہیں سیکھنا۔“

”میں تم پر زور نہیں ڈال رہی ہوں مندل۔۔۔۔۔ صرف مشورہ دے رہی ہوں۔ انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی چیز میں ماہر ضرور ہونا چاہیے۔ تمہیں ستار کا شوق ہے تو بہتر ہے کہ تم یہ ہی سیکھ لو۔“

”انہیں نے دیکھا تھا کہ دونوں ماں بیٹی میں سنجیدہ گفتگو ہونے لگی ہے تو اس نے وہاں سے چلے جانا بھی بہتر سمجھا تھا۔

”آپ کہتی ہیں تو سیکھ لیتی ہوں۔“

”اچھا ہوتا ہے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا، میری جان۔۔۔۔۔ میں تو چاہتی تھی کہ گھر کی باقی بچیاں بھی کچھ نہ کچھ سیکھ لیں۔ لیکن کسی پھوپھو نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔“

”جیسے تم توجہ نہیں دیتیں ہماری باتوں پر۔۔۔۔۔“ پھوپھو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی القہر دیا تھا۔

”آپ کی کیا بات نہیں مانی میں نے تمہیں پھوپھو۔۔۔۔۔“ چاند ادب سے بولی گئی۔

”ویسے تو بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل نہیں مانتی ہو۔۔۔۔۔ کئی بار کہا ہے کہ کچھ تیار تیار رہا کرو۔۔۔۔۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو۔۔۔۔۔ لیکن تم میری سنی ہی نہیں ہو جو پورا رات انہیں کے گھر سے آئے تھے کم از کم وہ ہی پہن لیا کرو۔ انہیں بھی تم نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“

”وہ میں نے مندل کے لیے رکھ لیے ہیں۔“ چاند نے محبت سے مندل کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”مندل کی قسمت کے اسے مل جائیں گے۔ تم تو انہیں استعمال کرو۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی مندل کی شادی کون سا بھی ہو رہی ہے۔“

”ہاں انہیں کی شادی ہوگی۔“ مندل نے ہنس کر کہا تھا اور پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔

”ظاہر ہے۔۔۔۔۔ انہیں کے لیے کوئی رشتہ دیکھا ہے کیا۔؟“

”آپ نے انہیں کے لیے کچھ رشتے بھی پسند بھی آئے ہیں۔ بس یہ بستی کے مہمان ہو کر چلے جاتیں۔ پھر ان کو گھر ملائی ہوں۔“

”بستی کے مہمان کون ہیں۔؟“

”تم نہیں جانتیں کیا۔؟“

”جاندے ناں میں گردن ہلائی تھی۔

”بستی نے تو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن میں نے رحبانی سے پوچھا ہے۔ ایمن اور کول کی والدہ۔۔۔۔۔ روشن بیگم

”سری ہیں گھر میں۔“

”کیا ج میں۔۔۔۔۔؟“ انہیں شدید حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

”وہ یہاں کیا کرنے آرہی ہیں۔؟“ ناچاہتے ہوئے بھی چاند کے لہجے میں ناگواری آئی تھی۔

”جہاں تک میرا خیال ہے۔ بستی اور رحبانی دونوں نے اب شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کول اور ایمن سے ہی۔“

”اتنا عجیب من کر دیا۔۔۔۔۔ ویسے بھی تو وہ دونوں زندگی بھر انہی کے ساتھ رہے ہیں۔ اب اگر بیاہ کر خوں میں لے آئیں گے تو اچھا نہیں ہو جائے گا۔ نسل بڑھے گے۔ دونوں کے بچے ہوں گے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”تم سارے اعتراضات کو چھوڑو۔۔۔۔۔ بس اچھے سے تیاری کرو۔۔۔۔۔ تم بہن ہو بستی کی۔۔۔۔۔ تمہیں زیادہ خاطر مدارت کرنا ہوگی۔ بہت اچھے سے مہمان نوازی کرنا ہوگی۔ ہم تو بستی کی کی پھوپھیاں ہیں۔ ہماری بات میں وہ دم خم نہیں ہوگا۔ کوئی بھی منہ اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ کوئی بیٹی میں ہمارا کیا حصہ۔۔۔۔۔ ہم تو تیسرا فرد ہیں۔ اس لیے تمہیں کہہ رہی ہوں۔ تم بات کرنا۔۔۔۔۔ سمجھ لیں۔“

”جی۔۔۔۔۔“

”اب جا کر تیاری کرو۔“

چاند عتاب دماغی سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔

☆☆☆

”دیکھنے میں لگتا ہے کہ ستار انگلیوں سے بجایا جا رہا ہے۔ حقیقت میں یہ مضرب سے بجایا جا رہا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ صرف بجانے والا جانتا ہے کہ یہ دونوں سے نہیں بلکہ من سے بجتا ہے۔ من شانت ہوگا تو انگلیاں شانت ہوں گی۔ انگلیاں شانت ہوں گی تو مضرب شانت ہوگا۔ اور تب ہی ستار کی شانت شانت ہوں گی۔ یاد رکھنا ستار شانت کا ساز ہے۔ اس میں شور و غل نہیں۔“ استاد صاحب اپنے دھیمے لہجے میں بولے تھے۔

”ستار بجانے سے پہلے بہتر ہے کہ تم جان لو کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو ستار کو ستار بناتی ہیں۔ ویسے تو دنیا میں بہت کچھ بکھرا ہوا ہے۔ لیکن باہمی خاموشیت کی چیزیں جب آپس میں ملتی ہیں تو ستار جیسا خوب صورت احزان پیدا ہوتا ہے۔“

”اور اگر خاموشیوں میں تصادم ہو تو۔۔۔۔۔“

”تصادم والا وجود بھی قائم نہیں رہتا۔ یاد رکھنا جن دو چیزوں میں باہم تصادم ہوگا اس میں سے کسی ایک

کا وجود قائم رہے گا۔ آگ اور پانی مل نہیں سکتے۔ ملانے کی کوشش کرو گے تو کوئی ایک چیز باقی بچے گی۔ یا اگر پانی کو سکھادے گی یا پانی آگ کو بجھا دے گا۔“

”جی..... میں سمجھتی۔“

”اب جان لو کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے ستار کی خاصیت ترتیب پاتی ہے۔ سب سے پہلے آتے ہیں کدو..... پیٹھا اور ٹھنڈا پھل..... جو جس قدر نرم ہوتا ہے سوکھ کر اتنا ہی سخت ہو جاتا ہے۔ پھر آتی ہے بڑکائی لکڑی..... جو اتنی کوری ہوئی ہے کہ ہر روپ میں ڈھل جانے کو تیار رہتی ہے۔ اور اس کے بعد آتی ہے کار میجر کی محنت..... جو دن رات اپنی کاغذ چلا چلا کر ستار کو ہموار کرتا ہے۔ سمجھ گئی۔“

”جی.....“ وہ مسکرائی تھی۔

”آج کے سبق سے تم نے کچھ سیکھا تو نہیں..... لیکن تمہارے دل میں ستار کی محبت پیدا ہوئی ہے۔ اور کسی بھی ساز کو بجانے کے لیے دل میں اس کی محبت کا ہونا ضروری ہے۔“ استاد جی نے توقف کیا تھا۔ ”اور اگر دل میں کسی انسان کی محبت ہو تو پھر تو کیا ہی کہنے۔“

استاد جی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ مندل بھی بے اختیار ہو کر مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

حویلی میں پچھلے چند دنوں سے کچھ عجیب صورت حال دیکھنے کو مل رہی تھی۔ جسے سب سے پہلے مندل نے نوٹس کیا تھا۔ رات کے کسی گہرے پہر بانسری بیچنے کی آواز آتی تھی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد حویلی کے کسی کمرے کے دروازے کے کھولنے کی آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اور زنجیر کے گرنے کی آواز.....

پہلے پہل تو مندل نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ بانسری رات کے اس پہر رحبانی بابا جاتے ہیں۔ جب کہ آواز کی قطع کے متعلق اس کا شک تھا بھی کہ وہ حویلی کے باہر سے آتی ہے۔ اور دروازہ کی آہٹ کو اس نے اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن آج جب اس نے رحبانی بابا سے پوچھا کہ بانسری رات کو وہ بجاتے ہیں تو انہوں نے انکار میں سر ہلایا تھا۔

”میں رات میں صرف سکھ بچاتا ہوں۔ باقی سازدن کے وقت کے لیے ہیں۔“

مندل کو پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا حویلی میں..... اسے خبر رہنی چاہیے تھی۔ آج وہ اسی جاگ رہی تھی۔ خبر رکھنے کے لیے..... وہ بانسری بجانے والے اور دروازہ کھولنے والے..... دونوں کو جانتا چاہتی تھی۔

پھر رات کے مخصوص پہر بانسری کی آواز حویلی میں اتری تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد حب توق حویلی کے کسی کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آہٹ پیدا ہوئی تھی۔

مندل اپنے پلنگ پر سے اتری تھی۔ وہ آج اس اتفاق کا پتا کر کے رہنا چاہتی تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ دالان میں آ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ صحن میں اسے ایک ہیولا نظر آیا تھا۔ چادر میں لپٹا ہوا۔ جو دائیں بائیں دھکتا ہوا چوری کرنے کے سے انداز میں حویلی سے باہر جا رہا تھا۔ مندل کو حیرت ہوئی تھی۔ جانے والی عورت تھی۔ لیکن کون؟ اور اس سے بھی بڑی بات کہ کیوں؟

حویلی میں ایک جگہ ایک کھڑکی ایسی بھی جہاں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ مندل وہاں جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چادر میں لپٹا سا یہ بے حد خاموشی سے حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔ حویلی سے ذرا دور درخت کے نیچے ایک لڑکا تنے سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔ سایہ اس تک پہنچا تھا۔ اور دونوں اپنے بائیں کرنے لگے تھے۔ برسوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ چاند روشن تھا لیکن بادلوں کی اوڑھ میں تھا۔ اپنی شکل دکھا رہا تھا لیکن لمبائی طور پر..... بہت دیر کے بعد حویلی کا دروازہ پھر سے کھولا گیا تھا۔ بے حد خاموشی سے وہ اندر کمرے میں جانے لگی تھی۔ جب مندل اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی لائین اس نے اس کے چہرے کے سامنے کی تھی اور پھر اس کی ہل ہلے آواز میں بولی تھی۔

”افشیں تم؟“ مندل کے لہجے میں حیرت تھی۔ افشیں نے شرمندگی کے مارے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

”کون تھا وہ.....؟ کس سے ملنے گئی تھیں تم باہر.....؟“

”شش..... آہستہ بولو..... کوئی سن لے گا۔“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری شش کی تھی۔

”پاکل لڑکی..... اور جو تمہیں کوئی باہر جاتا دیکھ لیتا تو.....“

”سب سو رہے ہیں۔“

”کوئی میری طرح جاگ جائے تو.....“

”کوئی تمہاری طرح چگا ڈر نہیں ہے اس حویلی میں..... جو رات رات بھر جائے۔“ افشیں کہہ کر اندر جانے لگی تھی۔ اپنے باز کے آشکار ہو جانے کے بعد وہ کچھ بوکھلا گئی تھی۔ ابھی مندل سے کوئی بات نہیں کرتا چاہتی تھی۔ لیکن مندل سب جانے بغیر اسے کہاں جانے دینے والی تھی۔

”جا کہاں رہی ہو۔“ اور ”کو“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔ ”میرے سوالوں کے جواب دو..... ایسے نہیں جانے دوں گی میں تمہیں.....“

”پہلی بات تو یہ کہ مجھ سے ذرا قبل سے بات کر دو تم..... میں تم سے بڑی ہوں۔ بلکہ گھر میں سب کڑلوں سے بڑی ہوں۔“ افشیں نے سنجیدگی لانے کی کوشش کی تھی۔ مندل نے ہشکل ہنسی کو روکا تھا۔

”جی تو بڑی آئی..... بلکہ بہت بڑی آئی..... باہر آپ کس سے مل کر آ رہی ہیں۔ کون صاحب تھے وہ.....“ اس نے بناوٹی ادب سے کہا تھا۔

”تمہارے ہونے والے بہنوئی.....“ افشیں کہتے ہوئے خود بھی ہنس پڑی تھی۔ مندل کو تو ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا تھا۔ افشیں کی بات پر اور اس کے انداز پر۔

”عادل نام ہے اس کا.....“ اس کا نام لیتے ہی افشیں کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

”مب سے دخول جھونک رہی ہو گھر والوں کی نظر میں۔“

”ایک سال ہو گیا۔“

”بے میرنی کی حد نہیں ہو گئی ویسے..... ایک سال ہو گیا۔ مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”جیسے تم نے میرا زاد کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”میرا زاد کی بات اور ہے۔ اس نے ابھی تک ایسی بات نہیں کی۔“

”لیکن عادل کر چکا ہے کہ وہ میرے ہاتھ نہیں جی سکتا۔“ افشیں شرمائی تھی۔

”تم تہینہ چھو چھو کو سب بتا دو افشیں۔“ مندل سنجیدگی سے بولی تھی۔ ”وہ چاند امی سے تمہارے لیے رشتہ دیکھنے کی بات کر رہی تھیں۔“

”عادل کی والدہ بیمار ہیں۔ جیسے ہی وہ ٹھیک ہوں گی ہمارے گھر آ جائیں گی۔ اب بہت رات ہو گئی ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔“ افشیں کہہ کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

منہ دل اپنے کمرے میں جانے سے پہلے کتنی ہی دیرواں کھڑی رہی تھی۔ افشین کا باہر جانا..... عادل سے ملنا..... یہ سارا منظر دیکھ کر اسے نجانے کیوں یہ خواہش ہوئی کہ کاش افشین کی جگہ وہ ہوتی اور عادل کی جگہ میرزا او.....

☆☆☆

”رات تم کہاں گئی تھی صندل.....؟“

”وہ..... کہیں بھی نہیں..... غسل خانے میں تھی۔“

”وہ..... کہیں بھی نہیں..... غسل خانے گئی تھی۔“

”تم وہاں نہیں تھیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا۔“

”نیچے کئی تھی۔ کچھ شور سنا کی دیا تھا۔ تجھے لگا کہ چور نہ ہو۔“

”اچھی بات ہے کہ تمہیں حویلی کی فکر ہے۔“ چاند کو بھی۔ انہوں نے صندوق کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ ”اس حویلی کی عزت کی فکر کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔“ اس نے پیار سے کہا تھا۔ صندوق شرمندہ ہوئی تھی۔ وہ چاند کی بات کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی۔ افسوس کے چکر میں اس پر رشک کر لیا گیا تھا۔

”تمہاری ستار کی کلاس کیسی رہی۔؟“

”بہت اچھی..... استاد جی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔“

”اچھے سے سیکھنا..... تم کسی چیز میں مہارت حاصل کرو گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ ستار تو ویسے بھی بہت مزاج ساز ہے۔ اسے بجانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔“

مزاج ساز ہے۔ اسے بجانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔“

”کل استاد جی بھی یہ ہی کہہ رہے تھے۔“

”لیکن بس مجھے ایک بات کا ڈر ہے صندل.....“ چاند کے چہرے پر پریشانی کے سنائے لہرائے تھے۔

”کیا.....“

”سازا اپنا خراج ضرور لیتے ہیں۔“

”وہ کیسے.....؟“
 ”وہ بجانے والے کو اس نقطہ تک پہنچا ہی دیتے ہیں جہاں سے ان کے سروں کی چچی سرگم نکلتی ہے۔“

چاند نے کہا تھا۔ وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”ہائسری.....! اے بھانے والے کو محبت کی اگتھا گہرائی میں لے ہی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اس کے ہونٹوں سے سحر ماہر نکال سکے۔ طبلہ..... بھانے والے کو دیوانگی تک لے جاتا ہے۔ مرلی..... کسی کی تلاش کو

مرقسم کر دیتی ہے۔ اور ستار.....“

”ستار کیا.....؟“

”ستارہ خراج ادا ہی ہے.....“ چاند نے کہا تھا۔ ”یہ کسی غم کو، کسی جدائی کو، کسی روگ کو بلاخر جنم دے ہی دیتا ہے۔“ میں دھکا کر دی کہ ستارہ خراج تم سے بھی بڑے.....“ انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ ”تم

ہی ستار بجاؤ مسکراتے ہوئے بجاؤ۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ صندل نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اب جلدی سے تیار ہو جاؤ..... بستی کی مہمان آنے والی ہوں گی۔ ہمیں ان کا اچھے سے خیر مقدم ہے۔ اچھے سے تیار ہو جاؤ تم۔“

”جی اچھا.....“

روشن بیگم نے سردی کے باوجود شغفوں کی بادرک ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جس کا رنگ تو نہیں تھا۔ لیکن اس پر
کام کی چمک نے اسے کافی شوخ بنادیا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنے کندھوں پر کشمیری شال ڈالی
تھی۔ ایک وقت دو کام ہو رہے تھے۔ ایک تو سردی سے بچا جا رہا تھا۔ دوسرا ساڑھی کے مختصر بلاؤں
کے جسم کا اسے پوشی ہو رہی تھی۔

رہی تھی اس کے جسم کی سرپوشی ہو رہی تھی۔
 سے جھانکتے اس کے جسم کی سرپوشی ہو رہی تھی۔
 دووں ہاتھوں پر مہندی لگائے۔ کلائیوں میں بھر بھر کر سونے کی چوڑیاں ڈالے ہوئے۔ اور بالوں میں مونچھے
 کے مجھے دکھائے روشن بیگم پورے کمرے کو روشن کیے بیٹھی تھی۔ بال بہت سلتے سے اٹھا کر سر پر کچھ کنبد سا بنایا گیا تھا۔
 ایک اب اتنی نفاست سے کیا تھا کہ عمر کو ظاہر کرنی جبریاں تو چھپ ہی جاتی تھیں۔ کچھ روشن بیگم اس قدر دل سے
 سکرانے کی عادی تھی کہ اس پر وہ تھکی عمر کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ لڑکیوں کا دل چاہ رہا تھا کہ روشن بیگم سے میک اپ
 لے لیں۔ کیا رعب خاتون تھی۔ سازشیں پہننا تو جیسے پورے ہندوستان میں اسے ہی آتا تھا۔
 لے لیں۔ کیا رعب خاتون تھی۔ سازشیں پہننا تو جیسے پورے ہندوستان میں اسے ہی آتا تھا۔
 لے لیں۔ کیا رعب خاتون تھی۔ سازشیں پہننا تو جیسے پورے ہندوستان میں اسے ہی آتا تھا۔

وہ سارے کمرے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ خامیہ زبان بنے سارے حویلی کے کینٹون میں سے کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ خاں کرچا ندائی کو..... وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ روشن بیگم سے کس طرح کی بات کرے۔ نہ تو وہ شوہر والی تھی اور نہ ہی بھائیوں والی..... اس سے پھر کس طرح کی بات کی جاسکتی تھی۔ اسے تو بستی کا روشن بیگم کو گھر پر بلا لانا ہی سخت لگا تھا۔ لیکن پھر بستی کا گھر بس جانے کے خیال سے وہ چپ ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا تھا۔ صندل روشن بیگم کے لیے سرخ شربت لے کر آئی تھی۔ اس نے گلاس روشن بیگم کے سامنے کیا تھا۔ روشن بیگم نے اسے دیکھا تھا۔

”چاند کی بیٹی ہوتاں.....“

”جی..... میں چاندی کی بیبی ہوں۔“

”تمہاری شکل اپنی ماں پر مبنی ہے۔ میں دیکھتے ہی پہچان چکی ہوتی تھی۔“ روشن بیگم نے سرخ شربت کا گھونٹ
 تے ہوئے کہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کے سارے زویر جھنجھٹائے تھے۔ صندل آگے سے مسکرا
 تھی۔ روشن بیگم یک ٹک اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے سادہ کھدو کا سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جس کے
 دواور گلے پر چاند نے سفید کر وشیے کی تینل بنادی تھی۔

”گھر کی ساری لڑکیاں ہی ماشاء اللہ سے بہت پیاری ہیں۔ مجھے بہت اشتیاق تھا تم سب سے ملنے کا۔“

”ہمیں بھی اشتیاق تھا۔ آپ کے ساتھ ساتھ ایمین اور کولم ”مامی“ سے ملنے کا۔“ لڑکیاں کہہ کر ہنسی تھیں۔
 نے سب کو گھورا تھا۔

روشن میم بات سمجھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ وہ تو چلتے مرد کی جیب میں پڑے نوٹ مسمیٰ لینے کی عادی تھی۔
 دل کی باریک آوازیں بھلا کیسے نہ سنتی۔

”ٹھیک ہے۔ اگلی بار آئی تو انہیں ساتھ لیتی آؤں گی۔“

”ہم انہیں لینے جائیں گے۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔“ لڑکیاں پھر سے ہنسی تھیں۔ تہینہ پھوپھو نے پھر سے گھورا تھا۔

”مجھے آپ کی حویلی دیکھنی ہے۔“

”جی جی..... کیوں نہیں..... صندل تم بستی کو بلا کر لای..... وہ اپنی مہمان کی رہنمائی کرتے ہوئے حویلی دکھائے۔“
 ”نہیں..... بستی کو بلا نے کی ضرورت نہیں ہے۔“ روشن بیگم نے صندل کو روکا تھا۔ ”مجھے آپ سب کے

